محمد سعید الرحمٰن علوی

حضرت امام الشاہ ولی اللہ الدھلوی رحمۃ اللہ تعالےٰ
ایک مجدد، مصلح اور مفکّر

حکیم الامت امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو پیدا ہوئے۔ گویا آخری بااختیار مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے ۴۴ سال قبل! آپ کے والد گرامی شاہ عبدالرحیم عالم باعمل اور صوفی باصفا تھے شاہ ولی اللہ کی علمی ترقیوں میں ان کی حسنِ تربیت کا بڑا دخل ہے جس کا ذکر شاہ صاحب نے اپنی خود نوشت میں جابجا کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب مغلوں میں سب سے زیادہ مذہب پرست بادشاہ تھا۔ لیکن یہ بات بھی شک و شبہ سے بالا ہے کہ جن انسانی خوبیوں کو مذہب مفید بتاتا ہے وہ اب بالکل مفقود تھیں۔ حتیٰ کہ خود اورنگ زیب کہتا تھا:-

راستی خدا ترسی، امانت داری اور اس طرح کے فضائل کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔

اس کی وجہ جو کچھ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شرع و فقہ کی گرم بازاری تو اس دور میں خوب تھی لیکن یہ باطنی برائیوں کا علاج نہیں۔ اس ذریعہ سے حدود و تعزیرات کا معاملہ تو قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن علاج دل کے لئے صاحب دل ہونا ضروری ہے۔ اور تزکیہ و احسان کی صفات عالیہ سے متصف ہونا لازمی ہے۔

اس ناسازگار ماحول میں شاہ صاحب پیدا ہوتے ہیں۔ دس مغل بادشاہ یا شطرنج کے پتے اور مہرے ان کی زندگی میں اوپر تلے برسرِ اقتدار آتے ہیں جن کے پاس علم و تقویٰ چھوڑ حکومت بھی ڈھنگ کی نہ تھی۔ ایران سے ہندوستان میں وارد ہونے والے شیعہ علماء دین اپنی مخصوص ذہنیت کی بنا پر ہر طرف مسلط تھے اور بادشاہ عیسائیوں کا شاہ کاران کے ہاتھ میں کٹھ پتلی۔ اس منظر میں شاہ صاحب کے اصلاحی کام کی قیمت کا اندازہ لگانا آسان ہوگا۔

یہ صحیح کہ وہ پوری طرح حالات کا رخ نہ موڑ سکے لیکن اس میں شک نہیں کہ سیاسی زوال کے باوجود انہوں نے قوم کے علمی سرمائے، اخلاقی فضائل اور انسانی خوبیوں کو کسی درجہ میں محفوظ کر لیا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں کہ اب تک اس پورے خطہ میں اس حوالہ سے جو رونق ہے اس کے پس منظر میں شاہ صاحب کے انفاس کی گرمی نظر آتی ہے شاہ صاحب کا سب سے بڑا احسان ہمارے نزدیک یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کو قرآن فہمی کے ذوق سے سرفراز فرمایا

اور پھر ان کی اولاد اور آگے شاگردوں نے قرآن و سنت کے حقیقی سرچشموں سے ملت کو روحانی و دینی آبیاری کا سامان کیا۔ ورنہ اس دور میں کلامی مسائل کی گرم بازاری منطق و فلسفہ جیسے مضامین اور اس طرح کی باتیں علمی خانوادوں کا سرمایہ فخر بنی ہوئی تھیں۔

شاہ صاحب نے قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں اس طرح کیا کہ وہ حقیقی معنوں میں "زندہ کتاب" کے طور پر سامنے آگیا۔ فارسی اس دور کی دفتری و علمی زبان تھی۔ اسی وجہ سے شیعہ عمائدین اور علماء سوء نیز صوفیان بے حقیقت ان کے اور ان کی اولاد کے دشمن ہوگئے حتیٰ کہ آئندہ چل کر ان کے عبقری اور ذہین پوتے ——————

—— شاہ محمد اسمٰعیل کے خلاف خیرآباد کے منطقی گھرانے کے سربراہ مولانا فضل حق نے جس طرح کی ہنگامہ آرائی کی اس کے پس پشت مناطقہ کی مخصوص ذہنیت، کلامی جھگڑے اور شاہ اسمٰعیل کا وہ ستھرا ذوق دینی تھا جس کی بنیاد پر وہ "داعی الی اللہ" کا صحیح کردار ادا کر رہے تھے۔ جب کہ مولانا فضل حق کا مشغلہ انگریز اور نوابان ریاست کی ملازمت، شطرنج کھیلنا اور منطق کے سبق پڑھانا تھا اور بس۔ پھر بھی کہ شاہ ولی اللہ اپنے عزیزوں میں حریت پھونک گئے تھے۔ اور اب وہ شعلہ جوالہ بن کر جس گھروندے کو بھسم کرنے والی تھی۔ اس سے بھی بہی خواہان فرنگ کی الرجی بھی قدرتی بات تھی۔

امام ولی اللہ دہلوی نے قوم کی بگڑی ہوئی اخلاقی ساکھ کو جس طرح سہارا دیا اور اس کے قوم کے اندر پھر جس طرح کی اخلاقی روح پھونکی اس کے لئے تحریک مجاہدین سب سے بڑا ثبوت ہے۔ حضرت سید احمد نے اپنے رفقاء سمیت اپنے شیخ شاہ عبدالعزیز کی نگرانی میں تبلیغی دوروں اور سفر حج کے ذریعہ جو روح عمل و اخلاق بیدار کی اور جس طرح سنگلاخ وادیوں کو قطع کر کے بالاکوٹ کے دامن میں پہنچے "الدال فالدال" کے مصداق اس کا اولین سہرا شاہ ولی اللہ کے سر ہے۔

تسلیم کہ بالاکوٹ ان حضرات کے خون سے رنگین ہوا۔ لیکن ان حضرات پر یہ تہمت تو ان کا کوئی بدترین دشمن بھی نہ لگا سکا۔ کہ وہ میدان چھوڑ گئے۔ ان ارباب عزیمت نے سر کھو دیا، بازی ہار دی لیکن سر کھونا وہ کارنامہ ہے جس کی مثال نہیں —— اور یہ کھو کر پھر جو چراغ روشن کر گئے اس کا اندازہ کرنا تو مستقبل کی تاریخ سے کر دو کہ آئندہ کی ہر تحریک کا چراغ اس چراغ سے جل رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے ترجمان مولانا عبیداللہ سندھیؒ کہتے ہیں:۔

شاہ صاحب کی فکر میں آفاقی وسعت ہے۔ اس کا سبب مولانا کے نزدیک یہ ہے کہ شاہ صاحب ایک طرف مسلمانوں کے علوم نقلیہ کے وارث ہوئے تو دوسری طرف علوم عقلیہ سے بھی انہیں حصہ وافر ملا۔ لیکن اس طرح نہیں کہ وہ مناطقہ کی قیل و قال کا شکار ہو کر رہ گئے

بلکہ انہوں نے خذما صفا ودع ما کدر پر عمل کرکے دکھلایا۔ اور خصوصاً خاتم المعصومین کے ارشاد گرامی کی پیروی کی کہ حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے۔ وہ اسے جہاں سے ملے، حاصل کرے۔

شاہ صاحب کا دور ایسا تھا کہ یہاں کے مسلمان سنی اور حنفی تھے۔ حکومتی دائروں میں اس سے انحراف گناہ سمجھا جاتا۔ ایران کے شیعہ اپنا رنگ جما رہے تھے۔ راجپوت سلطنت کے معاملات میں دخیل ہو کر ہندو فلسفہ اور اس کے افکار سے دلچسپی لینے لگے تھے حتیٰ کہ یورپ کے مشنریز اس سرزمین تک پہنچ کر مشغول کار تھے۔ یہ متضاد اور متخالف عناصر شاہ صاحب کے ماحول میں سرگرم عمل تھے۔ مناظروں اور مجادلوں کا زور تھا لیکن شاہ صاحب نے ان تمام مکروہ متھکنڈوں سے الگ رہ کر خالص علمی بنیادوں پر ملت کی تنظیم نو کا سروسامان کیا۔ انہوں نے ایسا طریق اختیار کیا کہ مسلمان امت اپنے اعتقادات پر پوری طرح جمی رہے۔ اس میں کسی قسم کا احساس کمتری کا مرض پیدا نہ ہو۔ وہ اپنی روایات علمی و تاریخی کی صحیح امین و وارث بنے۔ اور "علی وجہ البصیرت" اس کو سینہ سے لگائے لیکن کسی سے بیر نہ رکھے۔ بلکہ مذہبی وسعت قلبی سے کام لے کر اپنے پڑوسیوں اور ہم وطنوں سے مل جل کر رہے۔ کہ اس ذریعہ سے ان لوگوں کو اسلام کی برکات کا قائل کرنا آسان ہے۔

شاہ صاحب نے اس ضمن میں جو کوششیں کیں ان میں سرفہرست قرآن کا اس وقت کی علمی زبان میں ترجمہ ہے جیسا کہ عرض کیا گیا۔ انہوں نے مختصر حواشی بھی لکھے۔ اور جگہ بہ جگہ ان بنیادوں کو واضح کیا جو اسلامی سوسائٹی کی حقیقی بنیادیں ہیں۔ مثلاً سورہ الفتح کی آخری آیت میں محمد علیہ السلام کی رسالت کے ساتھ ان کے رفقاء کا ذکر کرتے ہوئے قرآن عزیز نے ان حضرات کو باہم رحماء لیکن ضدی ہٹ دھرم اور متعصب و انسانیت بیزار دشمنوں کے لئے ننگی تلوار اور سخت کہا ہے۔ پھر ان کی ذاتی خوبی عبادات میں ان کا انہماک بتلایا۔ اور واضح کیا کہ یہ سب کچھ محض رضائے الٰہی کے لئے وہ کرتے ہیں۔ کوئی ذاتی غرض نہیں اور آخر میں واضح کیا کہ ابتدا میں یہ جماعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس ایک کونپل کی طرح، لیکن ان خصائل و فضائل کی بنیاد پر وہ بڑھتے بڑھتے لہلہاتے کھیت میں تبدیل ہو گئی۔ حتیٰ کہ دشمنان صحابہ تلملا اٹھے۔ ان کے سینوں پر آریں چلنے لگیں۔ لیکن اس کھیتی کا دہقان خوش و خرم نظر آنے لگا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ موجودہ مسلمان قوم کے پنپنے اور ابھرنے کا اب بھی یہی طریق ہے۔ کہ وہ رسالت مآب کو اپنے لئے مرکز تسلیم کرکے اس میں بھائی چارگی کا انداز اپنائیں۔ انسانیت سے بیر نہ رکھیں۔ ہاں جو ہٹ دھرم ان کے وجود کے درپے ہوں انہیں جسد قومی کا فاسد مادہ سمجھ کر تہس نہس کر دیں۔ اور اپنے ان اعمال حیات پر دنیا سے کسی قسم کے صلہ کی امید رکھنے کے بجائے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعلیم کی روشنی میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں اور دنیا میں مساوات و برابری کے عادلانہ اصولوں کے مطابق زندگی گذاریں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ چاہتے ہیں۔ کہ انسان میں قوتِ ملکوتی اس طرح غالب آجائے اور ظاہر ہے کہ اس کا ذریعہ اعتقادات و اخلاق فاضلہ ہیں۔ کہ اس کے ذریعہ وہ بہیمی قوت پر غالب آجائے۔ اس ذریعہ سے انسان کو "نفس مطمئنہ" نصیب ہوتا ہے۔ اور یہی بات وراثت نبوت ہے۔ جس کا حدیث میں اس طرح ذکر ہے۔ کہ ہم انبیاء درہم و دنانیر چھوڑ کر نہیں جاتے۔ ہمارا سرمایہ تو بس علم ہے۔ جس کو اس سے کوئی حصہ مل گیا وہ بامراد ہوگیا۔ دوسری طرف انہوں نے تدریس حدیث کو یہاں وسیع پیمانے پر رائج کیا۔ اور اپنی مجددانہ بصیرت سے بخاری شریف کے بجائے مؤطا امام مالک کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کتاب میں اس سو ساٹھ کے اعمال کا تذکرہ ہے۔ جس میں کم سے کم اختلاف تھے۔ انہوں نے اس کتاب کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک اہل علم کے لئے عربی میں دوسری عام پڑھے لکھے حضرات کے لئے فارسی میں۔

تیسری طرف انہوں نے ایک مخصوص پیرایہ میں امت کی تاریخ مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا جس کا سب سے بڑا ثبوت چار ضخیم جلدوں میں ان کی کتاب "ازالۃ الخفاء" ہے۔ ایک عام سطح بین قسم کا انسان اس کتاب کو صحابہ کے فضائل و مناقب کی کتاب سمجھتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ کتاب اسلام کے اصول عدل کی ترجمان ہونے کے ساتھ اس کے قرن اول کے مثالی حکمرانوں کے انداز حکمرانی کی وضاحت کرنے والی ہے۔ ہماری تاریخ کا یہ حلیہ اسی دور سے بگڑتا ہے کیونکہ یہود اور مجوس کی پیہم سازشوں سے اسلام کے سیدھے سادے اصولوں کے علی الرغم اس دور میں نیا فلسفہ "شیعیت" کے نام سے مدون ہوا۔ اس فلسفہ میں قرآن عزیز کی تحریف اولین مخاطبین قرآن کی تنقیص۔ بوقت نہ ورت جھوٹ کی اجازت۔ اور "امامت" کے ایسے فکر کی نشان دہی ہے جس سے ختم نبوت کا مفہوم غارت ہو کر رہ جاتا ہے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب کے ذریعہ ان مفاسد کا قلع قمع کرنا چاہا۔ اور مسلمانوں کو راہِ اعتدال دکھانے کے ساتھ ساتھ انہیں تاریخ کے اصول فراہم کئے۔

چوتھی طرف انہوں نے اپنے اور آنے والے دور کی "عقلیت پسندی" کا توڑ کرنے کے لئے حجۃ اللہ البالغہ نام کی کتاب لکھی۔ جس میں اسلامی اصول و ارکان کی تعبیر و تشریح ایسے انداز سے کی۔ کہ ایک عقل سلیم کا مالک انسان پوری طرح پر حقیقت حال سے آگاہ ہو سکتا ہے بقول مولانا سندھی

> "شاہ ولی اللہ کی حکمت کا خاص جوہر یہ ہے کہ وہ وحی سے حاصل شدہ دین اور عقل کی پیدا کردہ حکمت میں تضاد نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک انسان کے دماغ میں کوئی چیز باہر سے نہیں آتی۔ استدلال اور استنتاج کی دور دراز راہ سے انسان جن حقائق تک پہنچتا ہے وہ فلسفہ و حکمت ہے۔ نبی کے ذہن پر حقائق کا نزول براہ راست ہوتا ہے لیکن عام انسانوں کا معاملہ ایسا نہیں۔ اس لئے وحی عقل و حکمت کی وہ آخری منزل ہے جس کے بعد کوئی منزل نہیں"

اسی مفہوم کو آپ کے پوتے شاہ محمد اسمٰعیل شہید اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

انبیا ر بشر ند ولیکن نوع دیگر ۱؎

آگے فرماتے ہیں کہ عام انسانوں کے کمالات کی جہاں تکمیل ہوتی ہے وہاں سے انبیا علیہ السلام کے کمالات کی ابتدا ہوتی ہے ۲؎

اسی کتاب میں شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالی انفرادی اور معاشی مسائل پر کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر کچھ کہنے سے قبل ہم اس طرف بھی توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے امت کے تاریخی تسلسل کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ کیونکہ اس میں بھی امت کی اجتماعیت کا راز ہے خاص طور پر برعظیم پاک وہند کے حوالہ سے **تو** مولانا عبیداللہ سندھی کے بقول انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی کے چھوڑے ہوئے کام کو پکڑا اور آگے بڑھایا۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسئلہ میں حضرت مجدد اور شیخ ابن عربی کے درمیان بظاہر جو اختلاف کی خلیج نظر آتی ہے۔ اپنے حکیمانہ انداز سے اس کو پاٹنا چاہا۔ اور اس میں خاصی تعداد تک کامیابی ہوئی جس کا اندازہ اس فن میں ان کے علوم کے وارث ان کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین کی کتابوں سے ہو سکتا ہے۔

مولانا سندھی مزید کہتے ہیں کہ

ہندوستان کا ایک دور تیمورلنگ سے لے کر اورنگ زیب تک ختم ہوتا ہے۔ جس کے خاتم حضرت مجدد الف ثانی ہیں۔ تو دوسرے دور کے فاتح شاہ ولی اللہ ۔۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ خاتم اور فاتح میں مماثلت اور اشتراک ضروری ہے اسی طرح یہ بات بڑی دلچسپی کی ہے کہ بعض لوگ دور حاضر کی اصطلاحات سے مرعوب ہو کر شاہ صاحب کو "ایک انقلابی" ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں حالاں کہ وہ مجدد اور مصلح تھے نہ کہ انقلابی۔ اس دقیق فرق کو مولانا سندھی اس طرح واضح کرتے ہیں :۔

> شاہ صاحب ان معنوں میں انقلابی نہ تھے کہ وہ پہلی سوسائٹی کو ختم کر کے اس کی جگہ بالکل ایک نئی سوسائٹی میں پیدا ہوئے۔ گو اس میں زوال شروع ہو چکا تھا اور وہ بہت سی خرابیاں قبول کر چکی تھی لیکن جس اساس پر وہ قائم تھی وہ ابھی بالکل کھوکھلی اور فرسودہ نہ ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس اساس کی اصلاح کی دعوت دی (اور یہی پیغمبرانہ طریق ہے) اور اس میں جو غلط باتیں داخل ہو گئی تھیں ان کی نفی کی۔ چنانچہ جب وہ اپنی کتابوں میں اس سوسائٹی اور اس کے مختلف طبقات کو مخاطب کرتے ہیں تو اپنی بات سمجھانے کے لئے اس سوسائٹی کے مسلمات اور علوم متعارفہ کو دلیل اور مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے مخاطبین ان باتوں پر یقین رکھتے تھے اور ان باتوں کو

مثال کے طور پر پیش کرنے سے اصل مقصد کی طرف آسان سے بلایا جا سکتا تھا۔

اس بات کو اصول فقہ کی زبان میں "عرف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم یہی ہے۔ کہ کسی سوسائٹی اور قوم میں اگر کوئی اچھی چیز موجود ہے اور اسلام کے مسلمات سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا تو اسے چھیڑا نہ جائے۔ ورنہ معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی۔ قرآن عزیز میں عرف، معروف اور اس قسم کے الفاظ بکثرت آئے ہیں اور ان کا بھی یہی مفہوم ہے۔ احقر نے اس ضمن میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا ہے جو "منہاج" کے مصادر تشریعیت نمبر میں عنقریب چھپ کر آنے والا ہے۔ اسلام کے اس اصول عرف کو سمجھ اور پہچان لیا جائے تو کسی سوسائٹی کی اصلاح بہت آسان ہو جاتی ہے۔ ورنہ بگاڑ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

شاہ صاحب نے معاشی مسائل کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا جیسا کہ ابتداء میں اشارہ ہوا۔ لوگ حیران ہیں کہ ایک حکیم، مصلح، مجدد اور داعی الی اللہ ان دنیوی بکھیڑوں سے کیا لینا چاہتا ہے۔ اصل میں لوگوں نے سمجھا ہی نہیں کہ معاش کا مسئلہ کتنا اہم ہے؟ لوگوں کے خیال میں چند وقت کی نماز، مہینہ کے روزے اور ایسے ہی چند اعمال کا نام دین ہے اخلاق فاضلہ، رزق حلال، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، اور اس قسم کی باتوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔

آج خود ہمارے ملک میں انسان کے بنیادی حقوق بری طرح پامال ہو رہے ہیں۔ انسان کو نہ تو روٹی میسر ہے نہ کپڑا۔ اس کی عزت محفوظ ہے نہ جان۔ اب علاج معالجہ، تعلیم کی سہولتیں میسر نہیں۔ ایک خاص طبقہ تو وافر طریق سے مال اسباب دنیا لوٹ رہا ہے۔ لیکن عام انسانی آبادی ان نعمتوں سے محروم ہے۔

نام نہاد اہل علم کا ایک طبقہ اس قسم کے عیش پسند عناصر کی سرپرستی کرتا ہے اور اس کے صلہ میں اس طبقہ کی پانچوں انگلیاں گھی میں رہتی ہیں۔ لیکن دکھی انسانیت کی کوئی فکر نہیں کرتا۔ ہماری اس خطرناک غفلت کے نتیجہ میں آج پورا ملک عیسائی مشنری کی زد میں ہے۔ ان کے ہسپتال، تعلیمی ادارے اور اس قسم کے دوسرے ادارے جو کچھ کر رہے ہیں اس کے نتیجہ میں حضور اکرم علیہ السلام کا وہ ارشاد سامنے آ رہا ہے۔ کہ کاد الفقر ان یکون کفرا

ہمارے یہاں کمیونزم اور سوشلزم کے خلاف لفظی بمباری تو بہت ہے۔ لیکن یہ "فتنے عملیاً" جن اسباب کے تحت پروان چڑھ رہے ہیں۔ ان کی کسی کو فکر نہیں۔ شاہ صاحب نے اس فکر و فلسفہ کے بانی و موجد کارل مارکس کی پیدائش سے صدی بھر قبل خفتہ بخت ہندی مسلمانوں کو توجہ دلائی۔ لیکن آج پوری دنیا میں دولت اور وسائل رزق میں چند خاندانوں کی اجارہ داری ہے اور بس۔

شاہ صاحب سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معاشی پالیسی کے زبردست مداح ہیں اور اس کا بار بار ذکر کرتے ہیں جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر شخص کے لیے برابر کا روزینہ مقرر کیا۔ اور جب بعض لوگوں نے کہا کہ کچھ افراد ایسے ہیں جو اسلام کے اعتبار سے مقدم ہیں جنہیں ہجرت و جہاد کی سعادتیں حاصل ہیں اس لئے

ان کی خدمات دینی کے سبب ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے۔ اس پر سیدنا صدیق اکبر نے فرمایا۔ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ وہاں سے ثواب واجر ملے گا۔ دنیا کا معاملہ ہر شخص کا یکساں ہے۔

لیکن ہم نے عجیب حال کیا کہ بعض لوگوں کے جوتوں پر سفیدی اور چمک نظر آتی ہے۔ لیکن بعض لوگوں کے چہرے کملائے رہتے ہیں۔ شاہ صاحب اس فکر پر سخت تنقید کرتے ہیں وہ قیصر وکسریٰ کی سوسائیٹیوں کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے حجۃ اللہ میں فرماتے ہیں:۔

واضح رہے کہ جب ایرانیوں اور رومیوں کو اپنی بین الاقوامی حکومتیں چلاتے صدیاں گذر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی کا اصل اور بنیاد بنالیا۔ اور یہ بھلا بیٹھے کہ مر کر پھر زندہ ہونا ہے۔ اور کسی اعلیٰ طاقت کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے۔ اور ان پر ان کے شیطانی نفس غالب آگئے۔ انہوں نے یہ وطیرہ اختیار کرلیا کہ عیش پرستی میں مزید انہماک سے سوچتے کہ اس سلسلے کو کس طرح مزید بڑھایا جائے اور پھر ان اعمال پر اتراتے — حتیٰ کہ دنیا کے نام نہاد حکما۔ وعقلاء بکارِ خویش دیوانہ ہشیار کے مصداق ان کی کمزوری محسوس کرکے ان کے درباروں میں جمع ہونے لگے۔ یہ لوگ ان کی عیاشی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ یہاں تک کہ ان سرمایہ داروں کا یہ حال ہوگیا کہ ان میں سے جس کے پاس ایک لاکھ درہم سے کم کی ٹوپی ہوتی اسے بخیلی کا طعنہ دیا جاتا۔ ایسے پر انہوں نے سر بفلک ایوان، بلا نے اور محلات وعمارات، پائیں باغ، حمام بنانے شروع کردیے۔ بیش قیمت سواری کے جانور اور راس انداز کی چیزوں کا اہتمام مقصد زندگی ٹھہرالیا۔ لباس فاخرہ اور انواع و اقسام کے کھانے کے بغیر ان کا گذر نہ ہوتا۔

شاہ صاحب نے پھر اپنی سوسائٹی کی مثال پیش کی۔ کہ آج دہلی کے ملوک وامرا اور ان کے درباری علماء صاحب زادوں، شہزادوں۔ بے ننگ ونام صوفیوں، شاعروں اور زر پرستوں کو دیکھ لو۔ تو بعینہٖ اسی سوسائٹی کا نقشہ نظر آئے گا۔

یہی حال اب یہاں ہے — جب یہ حال ہوجاتا ہے تو پھر خزانہ اور جیبیں خالی نظر آنے لگتی ہیں تاکہ ان نام نہاد ضروریات کے لئے حکومت آئے دن ٹیکسز کا دھندا بڑھاتی ہے۔ حتیٰ کہ عام آدمی ظلم کی چکی میں پس کر رہ جاتا ہے۔ عوام غریب کولہو کے بیل کی مانند سارا دن اور ساری رات کام دھندا کرتے ہیں۔ لیکن اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ کہ حکومت کے ظالمانہ ٹیکسز کا ان پر شدید بوجھ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں لوگوں

کے عقائد میں تزلزل آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کی کیفیت بے یقینی کا شکار ہوتی ہے۔ اسلام کے ابدی اصول بے وقعت ہونے لگتے ہیں۔ اور انسانی معاشرت بے راہ روی کا شکار ہونے لگتی ہے۔ جو لوگ دنیا کی اس زرق برق کیفیت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن صحیح طریق سے حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ چوری، ڈاکہ زنی اور اس قسم کے جرائم پر اتر آتے ہیں۔ اور کچھ لوگ علم و معرفت، شاعری اور ایسے ہر حوالوں سے بے کار محض بن کر درباروں اور حکومتوں سے دولت اینٹھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

الغرض عقائد، اخلاق، اعمال سب بگڑتے ہیں اور انسان حیوانیت کی سطح پر اتر آتا ہے ــــ کچھ کھاتے پیتے جانور کچھ خالی پیٹ جانور جو آخر کو محکمہ انسداد بے رحمی والوں کی نذر ہو کر رہ جاتے ہیں ــــ بقول شاہ صاحب کسی سوسائٹی کا یہ حال ہو جائے تو اس پر بربادی مسلط ہو جاتی ہے۔ وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ ایران و روم کی سوسائٹیاں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ ان میں بے انصافی، ظلم اور زیادتی کا دور دورہ ہو گیا۔

اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز سے پوچھا گیا کہ آپ کہتے ہیں کہ یہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ نہ رہے گی تو فرمایا، ہاں کہتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کیوں؟ تو فرمایا اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی نوع کا ظلم پسند نہیں۔ یہ سوسائٹی ظلم کا شکار ہے اس لئے بچ نہیں سکتی۔

الغرض شاہ صاحب کے محاسن گنوانے کا تو کوئی فائدہ نہیں کہ یہ بیکار اور جذبہ عمل سے عاری قوموں کا شیوہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے بڑوں کے گیت گا کر جینے کی فکر کرتی ہے ــــ اور ضرورت اس کی ہے کہ اس آئینہ ایام میں ہم اپنی شکلیں دیکھیں اور اصلاح کی فکر کریں۔

بقیہ : دارالعلوم دیوبند۔

ابھی تین سال پہلے دارالعلوم دیوبند نے اپنا جشن صد سالہ منایا تھا جس میں تمام عالم اسلام کی برگزیدہ شخصیت کے علاوہ وزراء، سفراء، ارباب حکومت اور علمی اداروں کے سربراہ تو شریک ہوئے ہی تھے۔ عوام الناس اور دیہات و قصبات کے لوگوں کا اتنا بڑا مجمع تھا کہ چشم فلک نے کسی مدرسے کے اعزاز میں محبت اور اخلاص کا یہ منظر شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ ایک اندازے کے مطابق اس جشن میں ۱۵ لاکھ سے زیادہ انسانوں نے شرکت کی تھی اس سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ مدرسہ دیوبند کو مسلمانان عالم کے دلوں میں کیا مقام حاصل ہے۔ ہندستان کو اس پر فخر ہے کہ عالم اسلام کی اتنی بڑی درس گاہ اس ملک کے ایک چھوٹے سے قصبے کا نام ساری دنیا میں روشن کئے ہوئے ہے۔